Date of Publication : 16-07-2014 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 July 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 July 2014
Issue: 28, Vol.:73

۲۲ تا ۲۸ رجولائی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۲۸، جلد نمبر: ۷۳

پہلی قسط

اقبال اور الٰہ آباد

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونی ورسٹی، الٰہ آباد (یوپی)

علامہ اقبال کا الٰہ آباد سے گہرا تعلق تھا اس کی پہلی وجہ تو اکبر الٰہ آبادی تھے۔ اکبر عمر میں اقبال سے بڑے تھے اور اُس عہد کے نہایت شہرت یافتہ، منفرد و ممتاز شاعر۔ اُن کی شاعری کا مخصوص طنزیہ و مزاحیہ رنگ اور قوم سے اُن کی سنجیدہ اور والہانہ محبت اقبال کو پسند آتی تھی۔ ممتاز اقبال شناس پروفیسر عبدالحق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"اکبر اور اقبال معاصر ہی نہیں ایک دوسرے کے ممدوح بھی تھے۔ دونوں کے مکاتیب میں ایک دوسرے سے گہری اور پُرخلوص عقیدت کا عکس و اظہار موجود ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اکبر کو چوٹ لگی تو اقبال نے نادیدہ دوست کو لکھا تھا: "میں تو آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھتا ہے۔ وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں"۔ دوسری طرف ۱۹۱۳ء میں اقبال کی نظم 'شمع و شاعر' شائع ہوئی تو اکبر نے خراج تحسین پیش کیا:

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور
ہر حرف سے ہے تجلّیِ حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور

اکبر نے اقبال پر ایک نظم بھی لکھی۔ والدۂ اقبال کی رحلت پر اکبر نے قطعۂ تاریخ لکھا جو لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ ۱۹۲۱ء میں جب اکبر کا انتقال ہوا تو اقبال نے ایک پُرسوز مرثیہ لکھا"۔

(اقبال: شاعر رنگیں نوا ص ۱۸۹)

دوسری وجہ گنگا جمنی تقدیس اور الٰہ آباد کی مخصوص سیاسی تحریک و تاریخ ہو سکتی ہے۔ علامہ الٰہ آباد چار بار آئے۔ ۱۹۱۳ء میں دو بار، ۱۹۲۰ء میں ایک بار اور آخری بار دسمبر ۱۹۳۰ء میں تشریف لائے۔ چوتھی بار کا الٰہ آباد آنا تاریخی ثابت ہوا۔ اس بار وہ مسلم لیگ کی دعوت پر خصوصی مہمان مقرر کی حیثیت سے تشریف لائے اور یادگار سالانہ خطبہ پیش کیا۔ اس مضمون میں علامہ کی الٰہ آباد آمد، قیام، جلسے کی روداد وغیرہ کا مختصر تحقیقی و تاثراتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کل ہند مسلم لیگ کا یہ سالانہ جلسہ جو ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں منعقد ہوا، دراصل اس کو پہلے لکھنؤ یا بنارس میں ہونا تھا لیکن بعض ناگزیر اسباب کے تحت انتظام کاروں اور لیگ کے عہدیداروں نے اُسے الٰہ آباد میں کرنا مناسب سمجھا، حالاں کہ دہلی اور بمبئی کے بعض ذمہ داروں نے الٰہ آباد کے انتظامات سے بے اطمینانی ظاہر کی تاہم اب اسے ٹالنا یا کسی اور شہر میں کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ندیم شفیق ملک اپنے مضمون 'علامہ اقبال کا سفر الٰہ آباد' میں لکھتے ہیں:

"لکھنؤ اور بنارس میں اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کرکے ملتوی کرنے کے بعد مولوی یعقوب اب تیسرے التوا کے حق میں نہیں تھے چناں چہ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولوی یعقوب نے شمس الحسن کو کونسل لیگ کا ایجنڈا درست کرکے روانہ کرتے ہوئے انھیں ہدایت کی کہ اس کو جاری کرنے کے بعد وہ فوراً الٰہ آباد چلے آئیں اور وہاں ہونے والے انتظامات سے انھیں جلد مطلع کریں۔ اجلاس کی حتمی تاریخیں طے نہ ہونے پر مولوی یعقوب نے اظہار تشویش کرتے ہوئے لکھا کہ حاجی محمد حسین نے تاریخ مقرر کرنے میں بڑی گڑبڑ کر دی ہے۔ علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ ۳۱ دسمبر کو واپس لاہور پہنچ جائیں، اس لحاظ سے پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر کی سہ پہر کو ہونا چاہیے اور باقی دو اجلاس ۲۹ دسمبر کو کرکے اسی شام کو جلسہ ختم کر دیا جائے، بہرحال اجلاس کی تاریخوں کے سلسلے میں علامہ اقبال اور مولوی محمد یعقوب کی خواہشات پوری نہ ہو سکیں"۔

مولوی یعقوب کی دل چسپی اور تحریک سے پروگرام میں تیزی آئی اور ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ء کو 'انقلاب' اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ مسلم لیگ کا اجلاس ۲۹، ۳۰ دسمبر کو الٰہ آباد میں علامہ اقبال کی صدارت میں ہوگا۔ اخبار میں یہ اپیل بھی کی گئی کہ مسلمانانِ ہند اس اجلاس میں ضرور شرکت کریں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ مسلم لیگ کا دہلی کا دفتر ایک ہفتے کے لیے الٰہ آباد میں منتقل کر دیا گیا۔ اخبار میں یہ بھی شائع ہوا کہ علامہ اقبال ۲۹ دسمبر کو سیٹھ عبداللہ ہارون جو اُن دنوں کراچی میں ایم ایل اے تھے، کے ساتھ پنجاب میل سے الٰہ آباد پہنچیں گے۔ 'انقلاب' اخبار کے نمائندے نے ۲۹ دسمبر کو الٰہ آباد سے مسلم لیگ کے اجلاس کی تیاریوں کا آنکھوں دیکھا حال کچھ اس طرح پیش کیا:

"مسلم لیگ کے اجلاس کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔ مولوی یعقوب تشریف لے آئے ہیں۔ تنظیم اور لیگ کے دفتر ۲۷ دسمبر سے کھل چکے ہیں۔ لیگ کونسل کا اجلاس ۲۸ دسمبر کو ہوگا جب کہ پہلا کھلا اجلاس ۲۹ دسمبر کو ۸ بجے صبح مجیدیہ اسکول کے باہر میدان میں منعقد ہوگا۔ مندوبین کے قیام کا انتظام بھی مجیدیہ اسکول میں کیا گیا ہے۔ ۲۹ دسمبر کو ایک بجے بعد دوپہر کشتیاں شروع ہوں گی، جو پورا دن جاری رہیں گی۔ علامہ اقبال اور عبداللہ ہارون جب پنجاب میل سے وارد ہوں گے تو انھیں ریلوے اسٹیشن سے جلوس کی شکل میں لایا جائے گا جو شہر بھر سے ہوتا ہوا نواب محمد یوسف کے مکان پر ختم ہوگا جہاں دونوں صاحبان فروکش ہوں گے"۔

(بحوالہ مضمون ندیم شفیق ملک)

اس تحریر سے یہ علم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس کو پہلے مجیدیہ اسلامیہ کالج کے میدان میں ہونا تھا کہ منتظمین کو اندازہ تھا کہ علامہ کو دیکھنے اور سننے کے لیے سامعین اور شائقین کا غیر معمولی مجمع ہو سکتا ہے۔ ویسے اُن دنوں الٰہ آباد میں اس نوعیت کے بڑے جلسے شہر سے قدرے الگ میو ہال میں ہوا کرتے لیکن علامہ اقبال کے شایانِ شان استقبال اور انتظام کے پیش نظر مجیدیہ اسلامیہ کالج کے میدان کے بارے میں سوچا گیا لیکن تمام اعلانات اور شہرت کے بعد منتظمین نے اچانک یہ جگہ بدل دی اور اس جلاس کا اہتمام شہر کے وسط محلہ یاقوت گنج کی ایک عمارت 'دوازدہ منزل' میں کر ڈالا۔ ایسا دفعتاً کیوں ہوا اس کے ٹھوس اسباب تو معلوم

نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ مسلم لیگ ان دنوں ایک حساس تنظیم واقع ہو چکی تھی اور یہ خصوصی جلسہ اس سے بھی زیادہ حساس نوعیت کا ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ کثرتِ ہجوم و عقیدت کے سبب شرکا کی تعداد کم ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا۔

شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی لمبی سڑک گرانڈ ٹرنک روڈ جب الٰہ آباد شہر سے گزرتی ہے تو ٹھیک اس کی گھنی آبادی اور پرانے بازار جسے 'نخاس کہنہ' کہتے ہیں، بالکل لب سڑک 'دوازدہ منزل' واقع ہے۔ اس دو منزلہ عمارت کو کافی عرصہ قبل شیخ میرو بخش نے بنوایا تھا جن کا تمباکو کا کاروبار تھا۔ شہر میں یہ خاندان تمباکو والا خاندان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مختار زمن اپنے ایک مضمون 'دوازدہ منزل سے منزل پاکستان تک' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عمارت کا نام دوازدہ منزل اس لیے رکھا گیا کہ اس کے صحن یا ہال کے چاروں طرف ۱۲ دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ یہ ایک کھلا ہوا وسیع صحن ہے جس کے چاروں طرف گیلریاں یا برآمدے ہیں۔ ان میں کنگورے دار دروازے ہیں۔ یہ عمارت تمباکو والوں کی رہائش اور بزنس کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اہلِ خاندان اوپر کی منزل میں رہتے تھے اور نیچے دوکانیں اور گودام وغیرہ تھے''۔

جس زمانے میں علامہ اس منزل میں تشریف لائے اس وقت شیخ میرو بخش کے پوتے رحیم بخش اس کے مالک تھے۔ رحیم بخش پڑھے لکھے انسان تھے اور عالموں و صوفیوں کے درمیان صحبت اختیار کرتے تھے۔ ان کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ اس جلسے کے اہتمام میں بھی وہ شامل تھے اور انہی کی تجویز پر یہ جلسہ اسلامیہ کالج کے بجائے دوازدہ منزل میں منعقد کیا گیا۔ اس کی دو وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ ایک تو یاقوت گنج سے ملے ہوئے محلے دائرہ شاہ اجمل، اٹالہ، بخشی بازار وغیرہ مسلم آبادیوں سے بھرے ہوئے محلے تھے اس لیے عام مسلمانوں کی شرکت متوقع تھی، دوسرے حفاظت وغیرہ کے لحاظ نظر سے یہ جگہ کالج سے زیادہ محفوظ تھی۔

مختار زمن جو اصلاً الٰہ آباد کے ہی تھے تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۷۷ء میں جب وہ الٰہ آباد تشریف لائے تو اسی مضمون کے ضمن میں وہ منشی فخرالاسلام اور نعیم بخش (رحیم بخش کے پوتے) سے ملاقات کی۔ اس وقت دوازدہ منزل کا جو نقشہ پیش کیا وہ کچھ یوں ہے:

''اپریل ۱۹۷۷ء کی ایک گرم صبح کو جب میں دوازدہ منزل گیا تو عجب سماں نظر آیا۔ وہ صحن جو ۴۷ برس پہلے فرش فروش سے آراستہ کیا گیا تھا اور جہاں اس صدی کے عظیم شاعر اور مفکر نے مسلم لیگ کا خطبہ صدارت دیا تھا، اُجاڑ سا پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ یہ حصہ کرائے پر ہے اور گودام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گیلریوں میں کچھ تھیلے اور بوریاں بکھری پڑی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں گائے بندھی تھی جو سست رفتاری سے جگالی کر رہی تھی۔ مکھیاں زیادہ تنگ کرتیں تو دم ہلا کر اڑا دیتی''۔

اور آگے وہ لکھتے ہیں:

''دراصل تقسیم کے بعد تمباکو والوں کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ ہندو آڑھتیوں نے مال کا لین دین کم کر دیا۔ بلوؤں میں الگ دھکا لگا۔ دوازدہ منزل میں کئی کرائے دار رکھنے پڑے۔ نعیم بخش نے تمباکو کے بجائے عطر، تیل کی دکان کھول لی۔ بہر صورت کسی نہ کسی طرح گاڑی چل رہی ہے اور اس خاندان کے فرد آج اس بات پر نازاں ہیں کہ ایک تاریخ ساز ہستی کے قدم اُن کے گھر آئے تھے اور ایک نئی تاریخ کا آغاز اسی گھر سے ہوا تھا''۔

یوں تو یہ عمارت آج بھی ہے لیکن مزید خستہ حال ہو اپنے شاندار ماضی سے بے خبر اور بے نیاز جلال و جمال۔ گرد و پیش بے نام سی تجارت و معصوم سی جہالت اور تقسیم ہند کی برکت کے سائے میں وہ اپنی شناخت گم کر چکی ہے اور اپنے ماضی و حال پر نوحہ کناں ہے۔ اس عمارت کا آج وہی حال ہے جو اُمت کا حال ہے۔

علامہ اقبال ۲۹ رو دسمبر کی صبح لاہور سے پنجاب میل کے ذریعے الٰہ آباد پہنچے۔ عام خیال ہے کہ ریلوے اسٹیشن پر علامہ کا تاریخی استقبال ہوا۔ بہ حیثیت مفکر و فلسفی اور اس سے زیادہ بہ حیثیت شاعر اور 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' کے خالق کی شہرت خواص اور عوام اور ہندو و مسلمان سبھی میں تھی، اس لیے ایک خیال ہے کہ اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ بھیڑ اتنی تھی کہ پلیٹ فارم، ریل کی چھتوں اور اسٹیشن کے باہر ایک ہجوم غفیر علامہ کے استقبال اور دیدار کے لیے اُمڈ پڑا تھا۔ احمد الدین مارہروی اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں:

''الٰہ آباد کے باسیوں کے بقول ایسا مجمع پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ پلیٹ فارم، ریل گاڑی کے ڈبوں کی چھتوں حتیٰ کہ ریلوے اسٹیشن کے باہر بھی کھوے سے کھوا اچھل رہا تھا اور مجمع سے گاہے بہ گاہے شاعرِ اعظم زندہ باد کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں''۔

جیسے ہی علامہ کی ریل گاڑی الٰہ آباد اسٹیشن پر آکر رکی تو شاعرِ اعظم زندہ باد کے نعرے نعرۂ تکبیر میں بدل گئے اور یہ نعرے الٰہ آباد کی مسلم قصاب برادری کی طرف سے زیادہ لگ رہے تھے کہ اس وقت یہ برادری خاصی مضبوط اور متحرک تھی اور قومی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔ ایک مضمون میں کہیں ملتا ہے کہ اس برادری کے لوگ لاٹھیاں لے کر اسٹیشن پہنچے تھے اور جس دم گاڑی رکی تو نعرۂ تکبیر کی صداؤں کے ساتھ ساتھ جوشِ عقیدت میں پلیٹ فارم پر لاٹھیاں اس قدر زور سے پٹکے کہ عجب سی صداؤں سے اسٹیشن گونج اٹھتا۔ ان صداؤں کو سن کر پہلے علامہ تھوڑا گھبرائے اور پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ریل سے نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر آئے۔ اس مجمعے میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل کے طلبہ اور مسلم وکلا کی بھی اچھی تعداد تھی۔ شہر کے دیگر محلے اور علاقے کے لوگ بھی موجود تھے۔ خواص و عوام کی بھیڑ کے بے ہنگم دائرے اور نعروں کی بے ترتیب گونج میں علامہ رفتہ رفتہ اسٹیشن سے باہر آئے۔ مسلم ہاسٹل کے طلبہ نے خیر مقدم کی غرض سے ایک تہنیتی نظم لکھی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ اس نظم کا ہر شعر الگ الگ طالب علم پڑھے گا۔ طالب علموں کی پوری ٹیم ایک مخصوص انداز میں خوش آمدید کہے گی لیکن غیر معمولی ہجوم نے سب کچھ منتشر کر دیا۔ اسی طرح اسلامیہ کالج کے طلبہ نے شاعرِ مشرق کو کچھ تحائف پیش کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہ بھی دھرا رہ گیا۔

علامہ اقبال کے قیام کا انتظام نواب محمد یوسف کے بنگلے پر کیا گیا تھا جو شہر کے سول لائنز کے علاقے میں ساؤتھ روڈ پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں نواب یوسف کا یہ بنگلہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے دور دور تک شہرت رکھتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ تحریکِ آزادی کے سلسلے میں جو حیثیت الٰہ آباد کے آنند بھون کی تھی جسے بعد میں اسی نوعیت کی سرگرمیوں کی وجہ سے سوراجیہ بھون کہا جانے لگا، مسلمانوں اور مسلم لیگ کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز نواب یوسف کا بنگلہ تھا۔ اسٹیشن سے نواب یوسف کے بنگلے کی دوری دو ڈھائی میل کی ہے۔ اس درمیان کا علامہ کا سفر پُرجوش استقبال اور بھیڑ بھاڑ سے پُر تھا۔ راستے بھر سڑکوں، درختوں، دیواروں وغیرہ پر انسانی سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔ نعروں کی گونج اور پھولوں کی بارش میں علامہ کا یہ مختصر سا سفر اپنی سست رفتاری اور عوام کی بے قراری کی وجہ سے خاصی دیر میں طے ہوا۔

نواب یوسف جو اصلاً جونپور کے تھے لیکن الٰہ آباد سے گہرا تعلق تھا۔ ساؤتھ روڈ جو اب نواب یوسف روڈ کے نام سے جانی جاتی ہے، پر اُن کا بنگلہ بلکہ کوٹھی اپنی عظمت اور شان و شوکت اور سرگرمیوں کے لیے دور دور تک شہرت رکھتی تھی لیکن اب یہی کوٹھی نواب صاحب کے انتقال، تقسیم ہند کے ملال اور مسلمانوں کے زوال کی تاب نہ لا سکی۔ نواب کے ورثا کی بے نیازی اور قوم و ملت کی بے حسی کا شکار ہو کر پہلے کھنڈر ہوئی اور اب پورے طور پر مسمار ہو چکی ہے اور اب اس کی جگہ حکومت نے بس اسٹینڈ اور اس کا دفتر قائم کر دیا ہے۔ دوازدہ منزل کے ٹوٹے پھوٹے آثار تو اب بھی موجود ہیں لیکن نواب یوسف کی کوٹھی کے تمام آثار پورے طور پر ختم ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی جیسے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے آثار ایک گم ہوتی ہوئی یاد بن چکے ہیں۔

اس کوٹھی کے عظیم الشان پھاٹک پر نواب یوسف نے خود پیش قدمی کر کے علامہ کا استقبال کیا اور بڑے تزک و احتشام سے کوٹھی کے اندر لے گئے اور غیر معمولی اور تاریخی نوعیت کے لمحوں کو قید کرتے ہوئے مشرقی نوعیت کی ضیافت میں مصروف ہو گئے۔ نواب یوسف جو اپنی شان و شوکت، نزاکت اور امارت کے لیے دور دور تک شہرت رکھتے تھے ایک صوفی فقیر اور شاعر قلندر کی خدمت اور ضیافت میں سراپا عجز و انکسار کا مجسمہ بنے ہوئے تھے اور اس خیال کی عملی تائید ہو رہی تھی کہ دنیا میں علم اور عالم کی ہی عزت ہوتی ہے۔

الٰہ آباد میں اُن دنوں ایک اسکالر اور لیڈر اور تھے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، جو الٰہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ تاریخ اور آئینی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے لیکن اردو اور ادبیات سے ان کی واقفیت برائے نام تھی تاہم اُن کی اردو دوستی اور مسلم دوستی کے بڑے چرچے تھے۔ مرادآباد سے صوبائی کونسل کے ممبر تھے۔ اپنی جیب خاص سے ایک ہفتہ وار 'استاذ' نکالتے تھے جس کا زیادہ تر کام ایک اور رفیق رحم علی الہاشمی دیکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ایک ریسرچ اسکالر بھی تھے احمد الدین مارہروی، جو ریسرچ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے سیاسی معاملات اور اخبار کا کام بھی دیکھتے تھے۔ علامہ اقبال کی الٰہ آباد آمد کے وقت ڈاکٹر شفاعت احمد خاں گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے لندن گئے ہوئے تھے۔ ان کے شاگرد احمد الدین مارہروی نے علامہ اقبال کی آمد اور جلسے میں شرکت کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیا جو بعد میں لاہور کے رسالہ 'اردو ڈائجسٹ' میں شائع ہوا۔ یقین ہے کہ یہ رپورٹ 'استاذ' میں بھی شائع ہوئی ہوگی لیکن اب یہ رسالے اور مکمل رپورٹ نہیں ملتے بس اس کے اقتباسات ہی ملتے ہیں۔ اب تو یہ اقتباسات بھی نایاب ہیں۔ ایک اقتباس میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب 'استاذ' کو ہم دونوں (رحم علی الہاشمی اور احمد الدین مارہروی) کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے اور مسلم لیگ کے جلسے کے انتظامات کی ذمہ داری اپنے چند رفقائے کار پر عائد کر گئے جن میں سر فہرست خان بہادر حافظ ہدایت اللہ ممبر کونسل اور اُن کے بھائی تھے۔ نشر و اشاعت کا کام ہم لوگوں کے سپرد تھا اور جلسے کی تنظیم و مہمانوں کا استقبال اور قیام و طعام کی ذمہ داری خان بہادر اور اُن کے ساتھیوں پر تھی۔ ہم نے اشتہارات، پوسٹر اور دستی اشتہارات کے ذریعے خوب

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

شاعر اور علمِ عروض

رحمٰن جامی
الحمرا 12-2-830/7/3
قاری صاحب لین، ہل کالونی
مہدی پٹنم، حیدرآباد-28

کیا شاعر کے لیے عروض جاننا ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے لیکن یہ تفصیل ضروری بھی ہے تاکہ آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ دراصل شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک 'وہبی' دوسرا 'کسبی'۔ یہ بات عام طور سے لوگ نہیں جانتے۔ ہم یہاں جانیں گے کہ وہبی شاعر کون لوگ ہوتے ہیں اور کسبی شاعر کون!

وھبی شاعر

وہبی شاعر وہ ہوتا ہے جسے اللہ میاں خاص طور سے شاعر بنا کر دنیا میں بھیجتا ہے۔ وہبی شاعروں کے بارے میں اہل عرب کا قول ہے کہ "الشاعر تلمیذ الرحمن" "یعنی شاعر اللہ میاں کا شاگرد ہوتا ہے۔"

اور اس ضمن میں اہل فارس کا یہ قول بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" یعنی شاعری پیغمبری کا جز ہوتی ہے۔ تبھی تو کہا جاتا ہے کہ اثر پذیری کے لحاظ سے ایک واعظ کی دو گھنٹے کی لمبی چوڑی تقریر ایک طرف اور ایک برجستہ شعر ایک طرف۔ چناں چہ اکثر یہ بات نوٹ کی گئی ہے کہ اردو کے بڑے بڑے مشہور و معروف مقررین اور خطیب حضرات گزرے ہیں اپنی تقریروں میں اثر پذیری کے لیے اشعار کا برجستہ استعمال کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر اپنے لڑکپن میں اور اس سے پہلے اپنے بچپن میں جن بزرگوں کی تقریریں سنی ہیں ان میں دکن کے شعلہ نوا اور بے باک قائد بہادر یار جنگ کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے بعد دوسرے قائد انوار العلوم کالج کے وائس پرنسپل جناب خلیل اللہ حسینی اور علامہ عاقل وغیرہم، بالخصوص غالب، سودا، مومن، حالی، حسرت، اکبر اور امجد حیدرآبادی کے اشعار کے علاوہ بطور خاص علامہ اقبال کے اشعار استعمال کرکے سامعین کے دلوں کو مسخر کرلیتے تھے۔ اور بلاشبہ ہم عصر مقررین بھی اسی طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ اس سلسلے میں بعض مذہبی شاعری کے جواز کے بارے میں اس اصول و ضابطے کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر خود حسان بن ثابتؓ کو جو مشہور شاعر تھے، حکم دیا کرتے تھے کہ کفار مکہ کا جواب شاعری میں دو۔ چناں چہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجد میں بطور خاص ایک الگ منبر بنایا گیا تھا جس پر کھڑے ہو کر حضرت حسانؓ کفار کا منہ توڑ جواب شاعری میں دیا کرتے تھے جسے سن کر حضورؐ اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ شاعری کے جواز میں بعض اللہ کے بندوں نے یہاں تک دعویٰ کردیا کہ اللہ میاں خود سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کی مثال میں قرآن کو پیش کیا جاتا ہے، بالخصوص سورۂ رحمٰن کو جس کی تقریباً ہر آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے ہی پرکشش انداز میں مسلسل قوافی کا اہتمام فرمایا ہے۔ قاری جب سورۂ رحمٰن لحن کے ساتھ پڑھتا ہے تو ترنم اور نغمگی قوافی کے ساتھ مل کر جو مسحور کن سرور پیدا کرتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ سورۂ رحمٰن میں اللہ میاں نے اپنے سب سے بڑے شاعر ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اگر یہ بات درست نہیں ہے تو اللہ میاں میری اس گستاخی کو معاف کردے گا مگر یہ بات قابل غور ضرور ہے۔ اگر قرآن شاعری نہیں ہے تو شاعری سے کم بھی نہیں بلکہ شاعری سے بھی بڑھ کر کوئی اعلا و ارفع اور مسحور کن ہے۔

کسبی شاعر:

کسبی شاعر دراصل وہ ہوتا ہے جو عروض کی کتابوں سے اوزان و افاعیل کو مخصوص بحور سے چن کر اور ناپ تول کر شعر کہنے کی مشق کرتا ہے۔ اس میں اس کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ افاعیل و ارکان پر ایک ایک لفظ کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ اس میں اس کو مسلسل مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کے لیے تھوڑا بہت موزونی طبع ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی موزونی طبع نہیں رکھتا تو وہ لاکھ مشق کرلے شعر وزن میں ڈھال نہیں سکتا اور اگر ڈھال بھی لے تو وہ خشکی کا شکار ہوجائے گا۔ اس کی زندہ مثالیں آج کے اکثر جدید شاعروں میں مل جائیں گی پھر بھی کہا جاتا ہے کہ آدمی پڑھ لکھ کر انجینئر بن سکتا ہے، ڈاکٹر بن سکتا ہے، وکیل بن سکتا ہے اور کسی بھی فن کا ماہر بن سکتا ہے لیکن کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا۔ ویسے انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے:

Practice makes a man perfect. میں نے اس میں دو اور لفظوں کا اضافہ کرکے مقولے کو درست اور مکمل کردیا ہے جو عصر حاضر کے اعتبار سے نامکمل تھا۔ اب مکمل یوں ہے:

Practice makes a man, woman and animal perfect.

اس جرأت اور گستاخی کے لیے معافی کا خواستگار اس لیے نہیں ہوں کہ میرے پاس اس کے لیے سرکس (Circus) کی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ سرکس میں عورت بھی مرد کے شانہ بہ شانہ پورے Perfection کے ساتھ کمالات کا مظاہرہ کرتی ہے اور اسی طرح جانور بھی اپنی بھرپور Practice کا مظاہرہ اپنے کمالات دکھانے میں کرتے رہے ہیں۔ کبھی انسان غلطی کرجاتا ہے تو Ring کے باہر ہوجاتا ہے مگر حیرت اور مسرت کی بات یہ ہے کہ جانور کبھی کوئی غلطی نہیں کرتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے مقابلے میں ایک حیوان کی Practice کچھ زیادہ ہی Perfect ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے انگریزی کے اس ادھورے مقولے کو حسب ذیل انداز میں مکمل کیا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا:

"Practice makes a man, woman and animal perfect"

گویا مشق آدمی، عورت اور جانور کو (کسی بھی فن میں) مکمل بناتی ہے۔ اس مقولے کے اعتبار سے کسی بھی مشہور شاعر کا کوئی بھی مصرعہ لے کر اس کے ردیف و قوافی منتخب کرکے افاعیل یا ارکان پر اس کا ہم وزن لفظ رکھ کر شعر تو کہا جاسکتا ہے (مگر بسا اوقات وہ خشکی کا شکار ہوجاتا ہے)۔ مثال کے طور پر چار ہم وزن ارکان فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن:

پیار کا قافلہ مصطفیٰ مصطفیٰ
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن
منزل مدعا مصطفیٰ مصطفیٰ
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

یعنی چار فاعلن کی تکرار سے ایک مصرع اور پھر مزید چار فاعلن کی تکرار سے ایک مکمل شعر حاصل ہوا:

پیار کا قافلہ مصطفیٰ مصطفیٰ
منزل مدعا مصطفیٰ مصطفیٰ

جو سیدھا سادہ اور مطلب و معنی کے اعتبار سے بھی نہایت آسان ہے لیکن جو غیر فطری شاعر یا کسبی شاعر ہوتا ہے افاعیل کے وزن پر ہم وزن لفظ رکھ کر شعر کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ وزن میں تو پورا اتر جائے مگر بسا اوقات وہ خشکی کا شکار ہوجاتا ہے یعنی پہلے مصرعے کا تعلق دوسرے مصرعے سے نہیں رکھ پاتا۔ پہلے مصرعے کا مطلب الگ دوسرے مصرعے کا کچھ اور ہوتا ہے تو شعر کو دولخت کہتے ہیں جو فن شعر کے لحاظ سے عیب کہلاتا ہے۔ یا پھر بڑی مشکل سے شعر وزن میں ڈھال بھی لے تو بیت برائے بیت کا شکار ہوجاتا ہے۔ بیت برائے بیت کی اصطلاح کا یہ مفہوم ہے کہ صورت شکل میں ردیف و قافیے کا حامل تو ہوتا ہے لیکن وہ کسی بھی مطلب و معنی سے محروم ہوتا ہے۔

میرے بچپن میں ہمارے خاندان کے سب سے بڑے بھائی غلام محمد طاس لاہور جاکر وہاں سے فارسی زبان میں منشی، منشی فاضل وغیرہ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ان کے نصاب تعلیم میں فارسی شاعری کے علاوہ علم عروض بھی شامل تھا اور اس کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے اس دور میں جس کسی نے بھی منشی، منشی فاضل اور کامل کی ڈگریاں حاصل کی تھیں وہ عروض پڑھ کر اور اس کی مشقیں کرکے چھوٹا موٹا شاعر بن ہی جاتا تھا اور ایک آدھ تخلص بھی ڈھونڈ ڈھانڈ کر رکھ لیا کرتا تھا اور ایک آدھ استاد بھی رکھ لیتا تھا کہ بہ وقت ضرورت استفادہ کرسکے۔ لیکن ایسے شاعر کی شاعری گھسے بندھے کی شاعری ہوتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ طرحی مشاعرے بھی منعقد ہوتے تھے اور جس میں کئی کسبی شاعر مشاعروں میں شریک بھی ہوتے اور داد بھی حاصل کرتے مگر یہ داد 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' والی داد ہوا کرتی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اینٹ پر اینٹ رکھ کر دیوار تو کھڑی کی جاسکتی ہے لیکن گھر نہیں بنایا جاسکتا اس کے لیے Infrastructure کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ شوق و ذوق فرضی محبوب کے عشق میں دو چار سال سے زیادہ نہیں چل پاتا، اس اثنا میں نوکری لگ جاتی ہے اس کے بعد شادی ہوجاتی ہے دو چار بچے ہوجاتے ہیں تو یہ کسبی شاعری کا جنون سر سے اتر جاتا ہے۔ سچا جو وہبی شاعر ہوتا ہے اس کے سر سے یہ بھوت اترتا ہی نہیں۔ دراصل شاعری ایک لائف ٹائم جاب ہے۔ یہی اصلی شاعری کی پہچان ہے۔ رہا یہ سوال کہ کیا شاعر کے لیے علم عروض کا جاننا ضروری ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ اگر آپ استاد شعرا کہلانا چاہتے ہیں یا پھر آپ کو نقاد بننے کا جنون ہے تو پھر علم عروض کا جاننا بے حد ضروری ہے۔

●●●

اردو دُنیا

سینئرٹی فہرست میں اردو ٹیچروں کا نام شامل کیا جائے

پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن کے ایک نمائندہ وفد کی ضلع بیسک تعلیم افسر سے ملاقات

اعظم گڑھ (۱۸ جون)۔ اتر پردیش پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن اعظم گڑھ کا ایک نمائندہ وفد ۱۶ جون کی دیر شام ضلع بیسک تعلیم افسر سے ان کے دفتر واقع جعفر پور میں ملا۔ اس موقع پر ایسوسی ایشن کے ضلع صدر سریندر پرتاپ سنگھ نے صحافیوں کو بتایا کہ ضلع میں پرائمری ٹیچروں کی ترقی کو لے کر بنائی جا رہی سینئرٹی فہرست میں اردو ٹیچروں کا نام ۱۱ جون کو اتر پردیش حکومت کے ذریعے جاری حکم نامے میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ٹیچروں کا نام ترقی کی سینئرٹی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا تو ایسوسی ایشن دھرنا و مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو ٹیچروں کے ساتھ ناانصافی کو برداشت نہیں کیا جائے گا کیوں کہ اردو ٹیچروں کی تعلیمی خدمات ہندی و دیگر زبان جاننے والے ٹیچروں سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد سے آج تک سرکاری اور انتظامیہ سطح پر اردو ٹیچروں کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا گیا ہے لیکن اب یہ سوتیلا پن دور ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت اپنے رویے میں تبدیلی لائے، انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے ورنہ ٹیچروں کا استحصال حکومت کو مہنگا پڑے گا۔ اس موقع پر سدھیر، اقبال، فیاض احمد، وقار احمد، اویناش رائے، ضلع سکریٹری جتیندر کمار رائے، خازن بجے پانڈے، سنتوش رام سہائے، سریندر یادو، برجیش یادو اور منوج کمار وغیرہ نے کہا کہ جو حکم نامہ ٹیچروں کے حق میں نہیں ہے اسے واپس لیا جائے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میڈیم اقامتی اسکولوں اور کالجوں کی بحالی کا مطالبہ

حیدرآباد (۱۳ جون)۔ آندھرا پردیش اور تلنگانہ کے 24 اردو میڈیم اقامتی اسکولوں اور 5 اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں کو انگریزی میڈیم کے اسکولوں اور کالجوں میں تبدیل کرنے کے خلاف اردو داں عوام میں بڑی برہمی پائی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک طرف حکومتیں اردو سے انصاف کی باتیں کرتی ہیں، مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے بلند بانگ دعوے کیے جاتے ہیں لیکن اردو میڈیم اقامتی اسکولوں اور کالجوں کو انگریزی میڈیم میں تبدیل کرنا فرقہ پرست ذہنیت کی عکاسی ہے۔ روزنامہ 'سیاست' کے صفحہ 2 پر ۱۲ جون کی اشاعت میں نمائندۂ خصوصی کی اس سلسلے میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس پر حرکت میں آتے ہوئے مہاجر حیدرآباد کے صدر مجیر (ریٹائرڈ) ایس جی ایم قادری کی قیادت میں ایک وفد نے سکریٹری اے پی ریسیڈنشیل ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ سے ملاقات کرتے ہوئے انھیں ایک یادداشت حوالے کی جس میں 'سیاست' میں شائع رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ انگریزی بلاشبہ ایک بین الاقوامی زبان ہے لیکن کئی ممالک میں بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس سے مسلمانوں میں ناخواندگی کو ختم کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ یادداشت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ترقی کے نام پر عہدیدار اس بات کو یقینی بنانے کے خواہاں ہیں کہ غریب مسلمان تعلیم سے محروم رہ جائیں، اسی وجہ سے اردو میڈیم کو ختم کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ یادداشت میں اردو اقامتی اسکولوں اور کالجوں کو بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

میدک عدالت کی خوبصورت عمارت تعمیر کے آخری مرحلے میں
لیکن اردو نظر انداز

میدک، آندھرا پردیش (۲۵ جون)۔ میدک گلشن آباد کے منتظر پر حضور نظام کے دور میں عدالت کی عمدہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ تاہم قدیم ہونے کے سبب سال ۲۰۱۱ میں اس عمارت کو منہدم کر کے جدید عمارت کی تعمیر کے لیے سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کے لیے 4.90 کروڑ روپے منظور کیے گئے اور اب تعمیر بھی آخری مرحلے میں ہے۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ انصاف کے ادارے میں زبان اردو سے ناانصافی کی جارہی ہے۔ اس جدید بلڈنگ کو خوب صورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ لیکن سائن بورڈ پر اردو کو غائب کر دیا گیا۔ جہاں تیلگو زبان میں سطور سے نام تحریر ہے وہیں اردو غائب ہے جس کو دیکھنے کے بعد اردو داں طبقے میں ناراضگی پائی جارہی ہے اور یہ احساس ظاہر کیا جارہا ہے کہ اگر انصاف کے ادارے میں ریاست کی دوسری سرکاری زبان کو انصاف نہیں ملا تو پھر کہاں انصاف ملے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بار کونسل کے ذمہ داران اردو زبان میں بھی نام تحریر کروائیں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

ضلع رنگاریڈی میں کئی اردو میڈیم مدارس اساتذہ کے نہ ہونے کے سبب بند

حیدرآباد (۱۵ جون)۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن تلنگانہ اسٹیٹ (سوٹا) کے قائدین محمد انوار الباقی، محمد عبدالنعیم، محمد خورشید علی، محمد رفیع، محمد عبدالسجاد افروز، محمد عبدالقدیر صدیقی، محمد خواجہ معین الدین اور خواجہ فاروق الدین وہاج نے کہا ہے کہ سوٹا ضلع رنگاریڈی کے عہدیداروں نے بتایا ہے کہ ضلع کے تقریباً 10 پرائمری اردو میڈیم اسکول اساتذہ کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی سال کے آغاز سے ہی بند پڑے ہیں اور محکمۂ تعلیمات کے علم میں لانے کے بعد بھی کوئی توجہ دینے والا نہیں ہے۔ تقریباً 2000 طلبہ و طالبات کا تعلیمی مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔ روزانہ مدارس میں طلبہ و طالبات حاضر ہو رہے ہیں مگر اسکول بند ہیں کیوں کہ اساتذہ کا انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا ارباب مجاز کلکٹر رنگاریڈی، وزیر تعلیم اور محمد محمود علی (نائب وزیر اعلیٰ) سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کریں۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

مسلم بچے اردو کی جگہ سنسکرت پڑھنے پر مجبور
کنٹونمنٹ بورڈ کے 7 میں سے ایک بھی اسکول میں اردو نہیں
کمشنر برائے لسانی اقلیت کی دفتر سے انکوائری کی ہدایت

نئی دہلی (۳۰ جون)۔ دہلی میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے لیکن دہلی سرکار ہو یا دہلی کنٹونمنٹ بورڈ، نئی دہلی میونسپل کونسل ہو یا میونسپل کارپوریشن سب کے اسکولوں میں اردو کے ساتھ تعصبانہ رویہ اختیار کیا جارہا ہے اور لسانی اقلیت کے بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق بھی نہیں دیا جارہا ہے اور ان پر جبراً سنسکرت تھوپی جارہی ہے۔ نوائے حق ویلفیئر ایسوسی ایشن کی آر ٹی آئی کے جواب میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے اسکولوں میں کافی تعداد میں مسلم طلبہ و طالبات ہونے کے باوجود انھیں اردو پڑھانے کا انتظام نہیں کیا جارہا ہے اور ان پر جبراً سنسکرت تھوپی جارہی ہے۔ دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے تحت کل 7 اسکول آتے ہیں، ان میں سے ایک اسکول معذور بچوں کے لیے ہے جب کہ باقی اسکول عام بچوں کے لیے ہیں۔ ان اسکولوں میں 69 مسلم طلبہ ہیں جن میں سے بیشتر اردو پڑھنا چاہتے ہیں لیکن انھیں مجبوراً سنسکرت پڑھنی پڑ رہی ہے۔ آر ٹی آئی کے جواب میں دہلی کنٹونمنٹ بورڈ نے بتایا ہے کہ اس کے تحت سات اسکول ہیں، ان میں سے کسی میں بھی اردو نہیں ہے۔ کریا اسکول فار اسپیشل چلڈرن صدر بازار دہلی کینٹ میں کل 127 بچے ہیں ان میں مسلم بچوں کی تعداد 6 ہے۔ اس کے علاوہ ایس پی سینئر سیکنڈری اسکول وی آئی ڈی لائنز دہلی کینٹ میں 285 بچے ہیں، ان میں چار بچے مسلمان ہیں جن میں سے کوئی اردو نہیں پڑھتا یہ سب سنسکرت کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ سی بی ایس ایس اسکول اولڈ نانگل دہلی کینٹ میں 201 میں سے 11 بچے مسلمان ہیں، یہ سب بھی سنسکرت پڑھتے ہیں۔ سی بی ایس ایس اسکول ارنی اینکلو دہلی کینٹ میں 220 بچے ہیں جن میں سے 19 بچے مسلمان ہیں اور ان میں سے کسی کے پاس اردو نہیں ہے، سب سنسکرت پڑھتے ہیں۔ سی بی ایس ایس اسکول صدر بازار دہلی کینٹ میں 155 میں سے سات بچے مسلمان ہیں، یہ سب بھی اپنی مادری زبان اردو پڑھنے کے بجائے سنسکرت پڑھتے ہیں۔ سی بی ایس ایس اسکول صدر بازار دہلی کینٹ میں 317 بچے ہیں جن میں سے 22 مسلمان بچے ہیں اور سب سنسکرت پڑھ رہے ہیں۔ سی بی ایس ایس اسکول کمہار واڑی میں 200 بچوں میں 6 بچے مسلمان ہیں اور سب سنسکرت پڑھ رہے ہیں، یعنی دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے کسی بھی اسکول میں لسانی اقلیت کے بچوں کو مادری زبان پڑھنے کی سہولت نہیں ہے۔ نوائے حق ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صدر اسعد غازی نے اس جواب کی کاپی کے ساتھ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، نیشنل کمشنر فار لنگوسٹک مائناریٹیز پروفیسر اختر الواسع، دہلی سرکار میں پرنسپل سکریٹری (ایجوکیشن) آنند وکمار اور ڈی پی ایس سی کے چیئرمین وجے جوشی اور دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے سی ای او جتیندر کمار کو خط لکھ کر ان سے اس جانب توجہ دینے اور قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات ایکٹ اور دہلی ایجوکیشن رولز 1973 کے تحت ان اسکولوں میں لسانی اقلیت یعنی مسلم بچوں کو ان کی مادری زبان اردو کی تعلیم دیے جانے کا بندوبست کیا جائے۔ اس مکتوب کے بعد نیشنل کمشنر فار لنگوسٹک مائناریٹیز کا دفتر حرکت میں آگیا ہے اور اسسٹنٹ نیشنل کمشنر فار لنگوسٹک مائناریٹیز ایس شیو کمار نے دہلی کنٹونمنٹ بورڈ کے سی ای او کو INVESTIGATION/DELHKI/ LS 2014/305 بھیج کر اس معاملے میں کارروائی اور انکوائری کرانے کی ہدایت دی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

جامع مسجد عالیہ حیدرآباد کے کانفرنس ہال میں منعقد
محفل اقبال شناسی سے ڈاکٹر یوسف اعظمی کا خطاب

حیدرآباد (۲۳ جون)۔ 'مسدس حالی' مسلمانوں کی دکھ بھری داستان کا شعری روپ ہے۔ یہ ہم سے پہلے کی نسلوں کے حافظے کا حصہ بن گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور پہلی جنگ آزادی کے بعد برطانوی سامراجیت کے عذاب کے نتیجے میں مسلمانوں سے حوصلے کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ ان میں عہد جدید کے چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اس پس منظر میں 'مسدس حالی' نے شعور کو بیدار کرنے میں اہم رول انجام دیا۔ سرسید نے مسدس کو اپنی نجات کا ذریعہ تصور کیا کیوں کہ انھوں نے حالی کو لکھنے کی ترغیب دی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسدس کی کیا اہمیت رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر یوسف

2013 کی بہترین کتابوں پر انعامات کا اعلان

اردو اکادمی دہلی نے کیا 28 موصول کتابوں میں سے 9 کتابوں کو اول اور 13 کو دوم انعامات کے لیے انتخاب

نئی دہلی (۲۵رجون)۔ ایوارڈ و گرانٹس سب کمیٹی اور اکادمی کی ایگزیکیٹیو کمیٹی کی مشترکہ میٹنگ میں سال 2013 کی بہترین کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اکادمی کو موصول 28 کتابوں میں سے جن 22 کتابوں کا انتخاب عمل میں آیا ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ 9 کتابوں کو اول انعام جو کہ 9100 روپے کی رقم کا ہوتا ہے، پیش کیا جارہا ہے اور 13 کتابوں کو دوم انعام جو کہ 7100 روپے کی رقم کا ہوتا ہے، پیش کیا جارہا ہے۔ یہ میٹنگ اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ انعامات کا اعلان عام طور پر مارچ میں کیا جاتا ہے لیکن اس بار عام انتخابات کے موقع پر نافذ ضابطہ اخلاق کی وجہ سے یہ اعلان نہیں کیا جاسکا تھا۔

اول انعام کے لیے منتخب کتابیں:
گفتگو، دوبدو (پروفیسر مظفر حنفی)، اردو میں اردو مرثیہ (ڈاکٹر ریاض الہاشمی)، تنقید و تجزیہ (ڈاکٹر عادل حیات)، اوراق پارینہ (نعیم احمد سعید)، شمالی ہند میں اردو شاعری کی ترقی میں امراء و والیان ریاست کا حصہ (ڈاکٹر ساجدہ زیدی)، ٹونک میں اردو کا فروغ (سید ساجد علی ٹونکی)، عروض، پنگل و تخیل (کندن لال کندن)، روح سخن (ڈاکٹر احمد علی برقی) اور عشق ہے (شہباز ندیم ضیائی)۔

دوم انعام کے لیے منتخب کتابیں:
بیان میر (ڈاکٹر احمد محفوظ)، آتش: عہد اور شاعری (محمد حیات الدین)، ہماری کائنات سائنس کی روشنی میں (پروفیسر اقبال محی الدین)، بازدید اور تبصرے (ڈاکٹر کوثر مظہری)، اردو شعر و ادب کا عہد زریں اور لسانی پہلو (ڈاکٹر عبدالناصر)، لالہ رخ (دویندر بخاری)، دل کی آنکھ سے ٹپکتا خون (پرویز اشرفی)، جہان تازہ و افکار تازہ (آصف اعظمی)، بجھے ہیں خواب نگر میں نے (انتظار نعیم)، مشعل راہ (ابوالفیض عزم سہریاوی)، آرزو سے صبح (ولی اللہ ولی)، دھنک (اعجاز امروہوی) اور ذکر مصطفیٰ (سلیم امروہوی)۔

منشی نول کشور انعام برائے ناشر مبلغ 9100 روپے نئی کتاب گھر کو دیا جائے گا۔ تمام انعام یافتگان کی خدمت میں ہر سال کی طرح نقد رقم کے علاوہ اردو اکادمی کا نشان (شیلڈ) اور سرٹیفکٹ بھی پیش کیا جائے گا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اعظمی نے جامع مسجد عالیہ کانفرنس ہال میں منعقد محفل اقبال شناسی کی 702 ویں نشست کو بہ عنوان 'مسدس حالی اور جواب شکوہ' پر ایک نظر خطاب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ خواجہ الطاف حسین حالی نے سرسید اور غالب سے فیض حاصل کیا۔ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان کا اہم مقام ہے۔ ادبی دنیا میں 'مقدمہ شعر و شاعری' کے ذریعے انقلاب کی راہوں سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری سادگی سے عبارت ہے۔ انھوں نے اکتساب غالب سے کیا، لیکن میر کی سادگی کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ 'مسدس حالی' میں بھی سادگی اور پرہیزگاری ملتی ہے۔ ملت کے عروج و زوال کی الم ناک تصویریں نظر آتی ہیں۔ وقت کے طویل فصل کے بعد اقبال نے نظم 'شکوہ' لکھی جس پر کچھ ملے برہم تھے۔ اس میں کائنات کے کارساز سے شکایت ہے۔ مشہور گیت کار شکیل بدایونی مسدس اور شکوہ کے مختلف انداز پر کہا تھا کہ حالی نے زبان سے کچھ نہ کہا اقبال شکایت کر بیٹھے۔ علامہ اقبال نے کچھ عرصہ بعد شکوہ کے تسلسل کے طور پر ڈرامائی انداز میں 'جواب شکوہ' تحریر کیا، اس نظم میں جو شعری آواز ہے وہ الوہی ادب لیے ہوئے ہے۔ 'شکوہ' میں جو شکایت تھی یہ اس کا جواب ہے۔ شاعر مشرق نے نظم کی پہلی کڑی میں شکایت کی تھی کہ کائنات کے کارساز کی مہربانیاں دوسروں پر ہیں اور مسلمان دولت و ثروت سے محروم ہیں۔ 'جواب شکوہ' میں بتایا گیا کہ نوع انسانی کو غلامی سے نجات دلانے والے اسلاف تھے۔ عہد جدید کے مسلمان مسلکوں، ذاتوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں، ان میں اسلاف کا خلوص ہے اور نہ قربانی کا جذبہ ہے۔ قوموں کے عروج کے لیے ان کے اندر ترقی کی خواہش بیدار ہونی چاہیے۔ صداقت، عدالت اور شجاعت کو اپنے سینے سے لگا کر اندھیری راتوں کو روشن کرنا چاہیے۔ کنوینر محفل غلام یزدانی ایڈووکیٹ نے عنوان کے ہر دو طرز سخن کو اردو شاعری کا شاہکار قرار دیا اور کہا کہ آج کل کے اردو زبان کے لب و لہجے سے واقفیت ان عقل و فہم کے ذخیروں کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں۔

(سیاست، حیدرآباد)

تلنگانہ ریاست میں اردو کے ساتھ انصاف کی اُمید

حیدرآباد (۱۵رجون)۔ ملک کی تقسیم کے بعد اردو پاکستان کی قومی زبان مقرر کی گئی۔ اس کے باوجود وہاں پر علاقائی زبانوں کا غلبہ ہے مگر ہندوستان میں لاکھ سازشوں کے باوجود اردو زبان کی ترقی و تحفظ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ انجنی کمار کے شعری مجموعہ 'گلستان کول' کی رسم اجرا تقریب سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے جناب زاہد علی خاں (مدیر اعلا روزنامہ 'سیاست') نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں راجا بہادر گوڑ، مہندرا اور لاہوتی جیسے نام شامل ہیں۔ اردو زبان کو زندہ رکھنے میں ہندو بھائیوں کی گراں قدر خدمات کو اردو داں طبقہ بھی فراموش نہیں کرسکے گا۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم ہند کے بعد سے اردو کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی تمام مذاہب کے لوگ شامل ہیں جو اردو کی ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔ جناب زاہد علی خاں نے انجنی کمار گوئل کے شعری مجموعہ جو اردو اور ہندی میں شائع کیا گیا ہے، کو اردو ہندی اتحاد میں ایک کارنامہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ادارہ 'سیاست' کی جانب سے ایک ایسا سافٹ ویئر تیار کیا گیا ہے جو اردو میں ٹائپ کرنے پر ہندی اسکرپٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور 'سیاست' کی ویب سائٹ پر مذکورہ سافٹ ویئر کا استعمال بھی ہو رہا ہے اور قابل فخر بات یہ ہے کہ سیاست ڈاٹ کام کے 16 لاکھ مشاہدین میں ایک لاکھ سے زیادہ نارتھ انڈیا کے وہ لوگ ہیں جو سیاست ڈاٹ کام کی ہندی تحریریں ملاحظہ کرتے ہیں۔ جناب زاہد علی خاں نے نئی ریاست تلنگانہ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ فراہم کرنے کے اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ریاست تلنگانہ میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ فراہم کرنے سے اردو کے ساتھ مکمل انصاف کی امید کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سابق کی طرح اردو کے ساتھ انصاف کو صرف اعلانات تک محدود رکھا گیا تو اردو کی ترقی اور حق کے لیے احتجاج کرنے والوں میں سب سے پہلا نام میرا ہوگا۔ انھوں نے ادارہ 'سیاست' کی جانب سے 'گلستان کول' کی رسم اجرا پر انجنی کمار گوئل کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ شعری مجموعے کی اشاعت تو عمل میں آتی ہے مگر مجموعے کی نکاسی میں تاخیر شاعر کے حوصلوں کو کمزور بنا دیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی شاعر کے لیے سب سے حسین اور خوشگوار منظر اس کے شعری مجموعے کی تیزی کے ساتھ نکاسی ہوتی ہے۔ انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں ہال میں موجود سامعین سے کہا کہ شعری مجموعے کی رسم اجرا میں شرکت کے ساتھ شعری مجموعے کی خریداری بھی شاعر کے حوصلوں کو مستحکم بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ پروفیسر مجید بیدار کے علاوہ ڈاکٹر فاروق شکیل، الحبیب ایاز نے اس موقع پر اپنا کلام پیش کیا۔ خان اطہر نے نظامت انجام دی۔ صوفی سلطان قادری، خلیق الرحمن، تسنیم جوہر، اسلم فرشوری اور رحیم اللہ خاں نیازی کے علاوہ دیگر معززین نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔

(سیاست، حیدرآباد)

کیوار گورنمنٹ اردو اسکول میں اساتذہ کی قلت

چنتامنی، کرناٹک (۲۹رجون)۔ چنتامنی حلقے کے گورنمنٹ اردو اسکولوں کے ساتھ افسران سوتیلا سلوک کر رہے ہیں، جس سے اردو اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے طلبہ و طالبات کا کافی نقصان ہو رہا ہے۔ چنتامنی حلقے کے چند گورنمنٹ اردو اسکولوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا گیا ہے جو ٹھیک سے بچوں کو پڑھا بھی نہیں سکتے، جن اساتذہ کو کسی اسکول سے دوسری جگہ تبادلہ کردیا جاتا ہے ایسے اساتذہ کو محکمہ تعلیمات کے افسران اردو گورنمنٹ اسکولوں میں روانہ کرتے ہیں۔ چنتامنی حلقے کے مختلف اردو گورنمنٹ اسکولوں میں اساتذہ کی قلت بہت ہی زیادہ ہے لیکن محکمہ تعلیمات کے افسران اس طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں اس لیے محکمہ تعلیمات کے کمشنر محمد محسن صاحب سے گزارش ہے کہ وہ چنتامنی حلقے کے اردو اسکولوں کا جائزہ لیں اور جن اردو سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی قلت ہے وہاں اساتذہ کا فوری طور پر تقرر کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح کا مسئلہ کیوار کے سرکاری اردو اسکول میں ہے، اس اسکول میں جو عارضی طور پر اسی ایم تھے وہ دوسری جگہ ڈیوٹی کرنے چلے گئے ہیں، اب اس اردو اسکول میں صرف دو ہی استاد اسکول کے تمام طلبہ و طالبات کو سنبھال رہے ہیں۔ چندروز قبل اس اسکول کے ایس ڈی ایم سی صدر و اساتذہ نے چنتامنی کے بلاک ایجوکیشن افسر سے اساتذہ کی قلت کے متعلق شکایت کی لیکن وہ بھی اس جانب غور نہیں کر رہے ہیں اس لیے محکمہ تعلیمات کے کمشنر محمد محسن صاحب کو چاہیے کہ وہ چنتامنی تعلقہ کے اردو گورنمنٹ اسکولوں کے علاوہ دیگر کنڑا اسکولوں میں جہاں اساتذہ کے عہدے خالی ہیں انھیں پُر کرنے کے لیے کوشش کریں۔

(سالار، بنگلور)

اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی میٹنگ

نجیب آباد، اترپردیش (۱۹رجون)۔ اترپردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن ضلع بجنور کی میٹنگ میں جنوری ۲۰۱۳ء میں تقرر کیے گئے اردو ٹیچرس کو ابھی تک تنخواہ نہ دیے جانے پر اظہار افسوس کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسکولوں میں مفت تقسیم ہونے والی دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کو بھی مہیا کرائے جانے کا مطالبہ کیا گیا۔ ضلع تعلیمی افسر کے دفتر پر منعقد میٹنگ میں ٹیچرس کی تنخواہ سے مکان بھتے کی کٹوتی ختم کرتے ہوئے سابقہ کی طرح مکان بھتہ دینے، جنوری ۲۰۰۶ء سے دسمبر ۲۰۰۸ء تک پروموشن ہوئے ٹیچروں کی تنخواہوں میں اضافے کی جلد ادائیگی کرنے اور جونیئر ہائی اسکول میں ٹیچروں کی خالی اسامیوں کو پُر کیے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔

سعادت حسین کی صدارت اور محمد ارشد جمال کی نظامت میں منعقد میٹنگ میں مصطفیٰ، نجمہ، خالدہ، تنیق احمد، عبدالرحمن، نعیم احمد، سجاد حسین، جتیش کمار، سلیم الدین اور ریاض الدین وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **تعلیمی اشارات**
مصنف : ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی
ضخامت : ۲۳۲ صفحات
قیمت : ۳۲۰ روپے
ملنے کا پتا : مدینہ پبلی کیشنز
ڈومن پورہ، کساری
مئو ناتھ بھنجن-275101
تبصرہ نگار : تنویر حسن ظہیر

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کا شمار ملک کے ممتاز ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ ویسے موصوف ایک اچھے ناقد، شاعر، صحافی اور ادیب بھی ہیں، لیکن ان کا اصل موضوع تعلیم ہی ہے اور موصوف کا قیمتی وقت تعلیمی موضوعات اور ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے سدِ باب اور ان کی تعلیمی ترقی پر غور و فکر میں گزرتا ہے اور اس کے لیے وہ ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'تعلیمی اشارات' اردو زبان میں تعلیم کے موضوع پر ایک اہم علمی اور معلوماتی کتاب ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ہیں۔ تعلیم کے موضوع پر موصوف کی یہ چھٹی کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی پانچ کتابیں اہل علم و دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں، جن میں 'تعلیمی تجربے'، 'تعلیمی جہات'، 'مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات'، 'تعلیم اور تعلیمی افکار' اور 'تعلیمی نکات' جیسی کتابیں طلبہ کے لیے مفید ثابت ہو چکی ہیں اسی کے پیش نظر یہ مذکورہ کتاب بھی تصنیف کی گئی ہے جو طلبہ، اساتذہ اور ان کے والدین کے لیے کارآمد ہے۔

مذکورہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ 'گفتنی' کے عنوان سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون شامل ہے اور 'ابتدائیہ' کے نام سے مصنف کے دیباچے کے علاوہ اس کے باب اول میں اکتیس مضامین شامل ہیں جو اہم کورسوں سے متعلق ہیں جس میں پہلا مضمون 'پروفیشنل کورسز' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے کریئر کی تشکیل میں طلبہ کے وقت کو ضائع ہونے سے بچانے اور وقت کا صحیح استعمال کر کے کیرئیر بنانے کے بارے میں تفصیل وضاحت کی ہے۔ صحیح تعلیمی رہنمائی نہ ہونے کے سبب طلبہ کا وقت اور صلاحیتیں دونوں ضائع ہو جاتی ہیں۔ صاحب کتاب نے اسی کے پیش نظر یہ کتاب تصنیف کی ہے تاکہ طلبہ صحیح کورسوں کا انتخاب کر کے اپنی زندگی کو نئی کامیابیوں سے ہم کنار کر سکیں۔

باب دوم میں ہندوستان کے چند اہم تعلیمی اداروں کے بارے میں تفصیلی جانکاری دی گئی ہے۔ اس باب میں پچیس مضامین شامل ہیں۔ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں ہے لیکن عدم واقفیت کے سبب طلبہ بہتر تعلیمی اداروں میں نہیں پہنچ پاتے جس کے سبب وہ اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر پاتے۔ مصنف نے ہندوستان کے ان اہم تعلیمی اداروں کا ذکر کیا ہے جو طلبہ کی زندگی کو باوقار بناتے ہیں جہاں کا ماحول صرف اور صرف تعلیمی ہے اور جن کا شمار دنیا کے اہم ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ صاحب کتاب نے ان اداروں کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں کون کون سی فیکلٹیاں قائم ہیں اور طلبہ کون کون سے کورسز یہاں حاصل کر سکتے ہیں اس کی جانکاری دی ہے۔

باب سوم بیرونی ممالک کے تعلیمی اداروں پر مشتمل ہے جن میں دنیا کے اہم ترین اداروں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی تعداد سترہ ہے۔ ہر طلبہ اور والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ بہتر سے بہتر تعلیم حاصل کرے لیکن جانکاری نہ ہونے کے سبب طلبہ اپنے ہی ملک میں بہتر تعلیم نہیں حاصل کر پاتے اس لیے، ان کے ذہن میں غیر ممالک کے تعلیمی اداروں کا تصور ہی نہیں آتا، اس لیے موصوف نے اپنے ملک کے اہم تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ غیر ممالک کے معیاری تعلیمی اداروں، ان اداروں میں شامل کورسز اور داخلے کے اصول و ضوابط اور اس کے بہتر نتائج کے بارے میں جانکاری دی ہے۔

اس کتاب کا آخری باب تعلیمی سہولیات پر مشتمل ہے جن میں تین مضامین شامل ہیں، پہلا مضمون 'تعلیم قرض' کے عنوان سے ہے۔ ہمارے ملک میں اعلا، معیاری، تکنیکی و پروفیشنل تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت ساری سرکاری سہولیات مہیا ہیں لیکن معلومات نہ ہونے کی وجہ سے خصوصاً مسلم طلبہ اس سے استفادہ نہیں کر پاتے اور بہت سے باصلاحیت اور غریب طلبہ بہتر تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مصنف نے اس باب میں تعلیمی قرض دینے والے اہم بینکوں کے نام، رقم کی حد اور دوسری ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ نیز اس کا بھی مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں کم از کم طلبہ کے لیے بلا سود تعلیمی قرض کا اہتمام کیا جائے۔ دوسرا مضمون 'تعلیمی وظائف' کے عنوان سے ہے۔ طلبہ کو بہتر تعلیم حاصل کرنے کے لیے کون کون سے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے تعلیمی وظائف دیتے ہیں ان کا نام اور وظائف کی رقم اور اس ادارے کی ویب سائٹ کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس باب کا آخری مضمون 'ہندوستان کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے' کے عنوان سے ہے، اس میں 500 ملک کی اہم یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی فہرست ویب سائٹ کے مطابق دی گئی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب اپنے استاد محترم ڈاکٹر انیس ادیب کے نام معنون کی ہے۔ ہر مضمون شروع کرنے سے پہلے ایک شعر دیا ہے جو مضمون سے ہم آہنگ اور بامعنی ہے۔ کتاب کا سرورق جاذب نظر ہے۔ مصنف کی دیگر تعلیمی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی نہ صرف طلبہ کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

OOO

نام کتاب : چنار کے پنجے
(افسانوں کا مجموعہ)
مصنف : دیپک بدکی
ضخامت : ۱۹۸ صفحات
قیمت : ۴۰۰ روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
دہلی-۶
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmai.com

دیپک بدکی اردو معاصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ سرزمین کشمیر سے تعلق رکھنے والے دیپک بدکی کا شمار کشمیر کے سرفہرست افسانہ نگار اور ملک کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

دیپک بدکی کی افسانوی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء سے ہوتا ہے جب ان کا پہلا افسانہ 'مسلی' ہمدرد سرینگر سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے مسلسل ملک اور بیرون ملک کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے، تاہم ان کو ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت بیسویں صدی کے اواخر میں حاصل ہوئی جب ان کا افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے' ۱۹۹۹ء میں شائع ہو کر افسانوی دنیا میں ایک مقام حاصل کیا۔ 'ادھورے چہرے' کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوی مجموعے 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور ایک زیر تبصرہ مجموعہ 'چنار کے پنجے' بھی ہیں۔

دیپک بدکی کا تعلق صرف افسانوی دنیا ہی سے نہیں رہا ہے بلکہ ان افسانوی مجموعوں کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور تین کتابیں تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مشتمل 'عصری تحریریں'، 'عصری شعور' اور 'عصری تقاضے' بھی شائع ہو کر شرف قبولیت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

دیپک بدکی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو افسانوں سے علامت، ابہام اور تجریدیت کے زور کو کم کر کے پھر سے اس میں کہانی پن پیدا کیا اور اسے قاری سے نزدیک کیا۔ دیپک بدکی کے افسانوں کا انداز نگارش بہت ہی سادہ، آسان، سہل اور زود فہم ہوتا ہے جس کی وجہ سے اردو کا ایک عام قاری بھی ان افسانوں سے وہ لطف اور حظ اٹھاتا ہے جو ایک خاص قاری حاصل کرتا ہے اس سے وہ فوری طور پر قاری کے ذہن میں اتر کر اس کو اپنے خیالات و احساسات کا شریک بنالیتے ہیں۔

دیپک بدکی کے افسانوں میں قلم نے ان کا ساتھ عصر حاضر کے تقریباً تمام مسائل پر دیا ہے اور انھوں نے ان تمام موضوعات کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے جو موجودہ معاشرے کا جزو لاینفک بن چکے ہیں کیوں کر ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف ادب کی افادیت کے قائل ہیں، اس اعتبار سے ان کے افسانوں کو ایک ایسا آئینہ قرار دیا جاسکتا ہے جس میں مختلف زاویوں سے سماج کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'چنار کے پنجے' مصنف کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں 19 اہم افسانے شامل ہیں۔ ان کے کئی افسانے ہندی، انگریزی، کشمیری، مراٹھی اور تیلگو میں ترجمہ ہو کر شائع بھی ہو چکے ہیں۔ مصنف نے جہاں اپنے افسانوں میں وقت کے اہم موضوعات کو جگہ دیا ہے وہیں ان کے افسانوں کا ایک اہم موضوع کشمیر کے حالات اور کشمیر سے ہجرت کے مسائل ہیں۔ اگرچہ ہجرت کے تعلق سے بہت سے افسانے ہماری نظروں سے گزرے ہوں گے لیکن مصنف کی تحریروں میں کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا جو کرب نظر آتا ہے وہ ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ 'چنار کے پنجے' میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں اس موضوع کو پیش کیا گیا ہے اور کئی افسانوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ایک افسانہ 'چنار کے پنجے' اسی عنوان سے کتاب کا نام بھی موسوم ہے، اس افسانے کے ایک اقتباس سے اس چیز کا بخوبی احساس کیا جاسکتا ہے:

''غربت میں اکثر وہ مرجھا جاتا ہے۔ شکست و نابود ہو جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے۔ اور پھر رہ جاتی ہیں یادیں۔ ڈھیروں ساری یادیں۔ تاریخ کی کتابوں میں مدفون یادیں۔ فرعونی تہذیب کی یادیں۔ یونانی تہذیب کی یادیں۔ یا پھر رہ جاتی ہیں فوسل اور آثار قدیمہ۔ ڈائنوسورس اور آرکیوپٹرکس۔ اسٹون ہینج اور جنتر منتر یا پھر رہ جاتے ہیں لونگ فوسل۔ گنکو بائلوبا اور ہم لوگ جو زندہ لاشوں کی طرح اپنی نسل کو گھسیٹتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔''

اسی طرح کئی اور افسانے ہیں جن میں گھر اور ہجرت کی کشمکش ایک ساتھ ملتی ہے جن میں سے 'ایک ٹیٹے مکان کا رشتہ' اور 'سفینہ کراس' وغیرہ ہیں۔

مصنف کے افسانوں کی زبان بالکل سادہ ہے کہیں کہیں مکالموں میں ہندی الفاظ کے امتزاج سے مکالمے پُر لطف اور معنی خیز ہو گئے ہیں۔ افسانوں میں کہانی کو بہت ہی خوبصورتی سے بنا گیا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں مصنف نے احتیاط سے کام لیا ہے۔

مصنف کے یہ سارے افسانے جو شامل مجموعہ ہیں، ملک اور بیرون ملک کے مشہور رسالوں جیسے 'کتاب نما' دہلی، 'استعارہ' دہلی، 'سب رس' حیدرآباد، 'شاعر' ممبئی اور 'پرواز' لندن وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مصنف کے یہ افسانے عالمی پیمانے پر شرف قبولیت سے سرفراز ہوں گے اور یہ افسانوی مجموعہ ادبی دنیا میں اپنا ایک اہم مقام متعین کرے گا۔

OOO

بقیہ: اقبالؔ اور الٰہ آباد

صفحہ ۲ سے آگے

پروپیگنڈا کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ کے نام اور ان کے کلام کی عالمگیر مقبولیت نے جادو کا کام کیا اور شاعر اعظم کے استقبال کے لیے تمام شہر اُمڈ آیا، جس میں مسلمانوں کی ترکی ٹوپیوں، عماموں اور پگڑیوں کے درمیان ہندوؤں کی غلیظ ٹوپیاں بھی خاصی تعداد میں نظر آتی تھیں"۔

غضنفر اللہ اور ان کے بھائی ذوالفقار اللہ اصلاً مراد آباد کے تھے اور ٹھیکیدار تھے۔ ایک ٹھیکے کے ہی سلسلے میں الٰہ آباد آنا ہوا اور پھر یہیں بس گئے۔ اسٹیشن سے سول لائنس میں جانے والی ایک خاص سڑک نور اللہ روڈ اُن کے جد امجد کے نام سے موسوم ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں اسی روڈ پر نور منزل کی کوٹھی تعمیر ہوئی۔ اسی کوٹھی میں دونوں بھائیوں نے علامہ اقبالؔ کی دعوت کی اور علامہ ۲۹ دسمبر کی شام اس کوٹھی میں تشریف لائے۔ غضنفر اللہ اور ذوالفقار اللہ اب موجود نہیں لیکن غضنفر اللہ کے بیٹے مسیح اللہ اور احسان اللہ بفضل تعالیٰ آج بھی موجود ہیں اور نور منزل میں رہتے ہیں۔ مسیح اللہ نے ایک گفتگو میں راقم الحروف کو بتایا کہ ان کے والد بڑے پکے مسلم لیگی تھے اور اقبالؔ کے بڑے معتقد۔ ۱۹۳۰ء کے اجلاس کے انعقاد میں وہ اور محمد حسین پیش پیش تھے۔ محمد حسین ہائی کورٹ کے بہت اچھے وکیل تھے اور مسلم لیگ کے سرگرم کارکن۔ ہائی کورٹ کے سامنے ہی اُن کا بنگلہ تھا لیکن اب الٰہ آباد میں اُن کے وارثوں میں کوئی نہیں۔ نواب یوسف کے بنگلے سے لے کر نور منزل تک کا سفر علامہ نے محمد حسین کی کار پر طے کیا جسے خود محمد حسین نے چلایا اور پیچھے علامہ اور غضنفر اللہ ایک ساتھ بیٹھے۔

(باقی آئندہ)

●◆●

بقیہ: بھوپال میں علمی، ادبی...

صفحہ ۸ سے آگے

احمد نقوی نے رقم کیں جو نواب صاحب کے رفیق و معاون تھے۔ ایک اور نام مولوی نور الحسن مارہروی کا ہے ان کی بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس سلسلے کے دوسرے اہل قلم میں مولوی محمد مہدی، مولوی جمیل احمد سہسوانی، عبدالقدوس اور حکیم عبدالحمید کا نام آتا ہے۔

بھوپال ریاست کے حکومت ہند میں انضمام کے بعد اردو سرکاری زبان نہیں رہی اور وقت کے ساتھ اس کی اہمیت کم ہوتی گئی جس کے نتیجے میں اردو زبان کا نئی نسل سے رشتہ کمزور پڑنے لگا لیکن یہاں کے دینی مدارس اور اسکول و کالجوں کے اردو شعبوں کی سرگرمی جاری رہی جن سے فارغ ہو کر نکلنے والے تازہ دم قلم کاروں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ ممتاز رموزی، ایم عرفان، حکیم قمر الحسن، جوہر قریشی، ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، کوثر چاند پوری، عبدالاحد خاں تخلص، ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر حامد حسین، محمد احمد سبزواری، اختر سعید خاں، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، ڈاکٹر اخلاق اثر، اقبال مجید، پروفیسر مختار شمیم، ہارون ایوب، نعیم کوثر، ابراہیم یوسف، ڈاکٹر آفاق حسین صدیقی، ڈاکٹر محمد نعمان اور انیس سلطان ایک طرف، اور دوسری صف میں مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری، علامہ وجدی الحسینی، مولانا حبیب ریحان ندوی، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن، مولانا شرافت علی ندوی، ڈاکٹر محمد حسان خاں کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے علم و ادب نیز مذہبیات کے شعبے میں اہم خدمات انجام دیں۔ اس کے ساتھ بھوپال کی علمی و مذہبی ترقیات میں یہاں کے مدارس کا بھی اہم حصہ رہا ہے۔ مدرسہ احمدیہ سے لے کر مدرسہ الہیہ، دارالعلوم تاج المساجد، جامعہ اسلامیہ مسجد ترجمہ والی، جامعہ حسینیہ خیر العلوم، مدرسہ حیات العلوم نسواں دارالحسنات، معہد الدراسات الاسلامیہ تو چند نام ہیں، ان کے علاوہ سینکڑوں مدارس نئی نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا قابل قدر کام انجام دے رہے ہیں۔ اسی طرح عصری علوم کی درسگاہیں حمیدیہ کالج، سیفیہ کالج، ایم ایل بی کالج، رویندر کالج، کستوربا کالج، نوتن کالج اور برکت اللہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، عربی اور فارسی سے ہزاروں طلبہ ہر سال تعلیم پا کر سرگرم زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ بھوپال میں علمی و ادبی اور مذہبی علوم کی ترویج و ترقی کا یہ جائزہ مکمل نہیں کوئی تشنہ ہے کیوں کہ وقت کم، قلم کوتاہ، داستان طویل ہے، ایک سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔

ماخذ:

۱- حیات بھوپال، مولف امین زبیری، ۱۹۲۸ء

۲- تزک سلطانی، مصنف نواب سلطان جہاں بیگم

۳- حیات سلطانی، مصنف محمد امین زبیری، ۱۹۳۹ء

۴- تاریخ ریاست بھوپال، مصنف عابد علی وجدی الحسینی، ۱۹۹۳ء

۵- اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ، مصنف ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، ۱۹۶۵ء

۶- مدھیہ پردیش میں اردو، پروفیسر سید نعیم الرحمٰن، ۱۹۹۳ء

۷- سہ ماہی فکر و آگہی، مدیرہ ڈاکٹر رضیہ حامد، ۱۹۹۳ء

۸- نواب سلطان جہاں بیگم، مصنف ڈاکٹر رضیہ حامد، ۲۰۱۰ء

●◆●

دوسری اور آخری قسط

بھوپال میں علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات

والیانِ ریاست، عُلمائے کرام اور اہلِ قلم کے وسیلے سے

عارف عزیز (20-گھائی نجر بھونچہ روڈ، تلیا، بھوپال 462001)

۱۸۹۸ء سے ریاست بھوپال کی تیسری حکمراں خاتون نواب شاہجہاں بیگم کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے دورِ حکومت میں اعلا فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کی خوب بہت افزائی ہوئی۔ اپنے والد جہانگیر محمد خاں کی طرح وہ صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں، پہلے شیریں بعد میں تاجور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا پہلا دیوان 'دیوانِ شیریں' اور دوسرا 'تاج الکلام' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک مثنوی 'صدق البیان' فنِ شاعری کا اعلا نمونہ ہے جس میں سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔ کئی دیگر نثری کتب کے علاوہ 'تہذیب اللغات' نام سے ایک نادر لغت بھی ان کی یادگار ہے۔ شاہجہاں بیگم اردو کے ساتھ ہندی میں بھی روپ رتن کے تخلص سے شعر کہتی تھیں۔ ہندی کے معروف ادیب بھارتیندو نے 'آریہ ورت' رسالے میں اس کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ بیگم صاحبہ کی علمی و ادبی حیثیت اور فنونِ لطیفہ سے نسبت کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان سے پہلے اردو زبان وادب کی تاریخ میں کوئی خاتون ان کے ہم پلہ نظر نہیں آتی۔ وہ صاحبِ طرز نثر نگار، ماہرِ لسانیات اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معیاری شاعرہ بھی تھیں۔ شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں بھی بڑے شاعر، عالم اور ادب نواز تھے۔ بیگم صاحبہ خود بھی اپنے محل میں مشاعروں کا اہتمام کراتی تھیں۔ 'تاریخ ادبِ اردو' کے مولف رام بابو سکسینہ نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے زمانے میں کم و بیش ڈیڑھ سو خواتین شعر کہتیں اور خواتین کے مشاعروں میں شرکت کرتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ شاہجہانی میں بھوپال علم وادب کا مرکز بن گیا تھا۔ اپنے شوہر کے تعاون سے شاہجہاں بیگم نے علما و فضلا کی سرپرستی ہی نہیں کی، سیکڑوں ایسی نایاب کتابیں بھی شائع کرنے کے لیے وسائل فراہم کیے جن کے چھپنے سے اس چھوٹی سی ریاست کا نام دنیا بھر میں مشہور ہوگیا۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق دورِ شاہجہانی میں چودہ تذکرے لکھے گئے۔ انھوں نے عصری تعلیم کے جگہ جگہ مدارس کھلوائے اور اردو کی ترویج واشاعت کے لیے 'مطبع شاہجہانی' کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ اس مطبع سے ۱۸۷۱ء میں اردو کا پہلا اخبار 'عمدۃ الاخبار' شائع ہوا۔ احمد علی اشہری کا نیم سرکاری اخبار 'دبیر الملک' بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ دیگر اخبارات ورسائل بھی نکلتے رہے۔ علم و ادب کے فروغ کے ساتھ بیگم صاحبہ کو اپنے ہم نام مغل شہنشاہ شاہجہاں کی طرح عمارات سازی کا گہرا شوق تھا۔ تاج المساجد جیسی مایۂ ناز مسجد کے علاوہ تاج محل، عالی منزل، بے نظیر، لال کوٹھی، گلشن عالم کی شان وشوکت کے باقیات لاکھ مٹانے کے باوجود آج بھی اس کے گواہ ہیں۔

ریاست بھوپال کی چوتھی اور آخری بیگم نواب سلطان جہاں نے ۱۹۰۱ء میں انتظام حکومت سنبھالا تو یہاں اردو زبان وادب کے ہر شعبے میں مزید ترقی ہوئی۔ وہ اعلا تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون تھیں بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ایک مصلح کا دماغ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ خود ۴۰ کتابیں تصنیف کیں جن میں سے بیشتر کتب تعلیم اور اس کے مسائل سے متعلق ہیں اور آج معیاری کر اس موضوع کی اہم کتابوں کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ 'روضۃ الریاحین' بیگم صاحبہ کی پہلی تصنیف ہے جس میں سفر حجاز کے احوال کے ساتھ حرمین شریفین کی مفصل تاریخ رقم کی گئی ہے۔ انھوں نے تربیت اطفال، تیمارداری، خانہ داری، معاشرت اور پردے کے موضوع پر بھی کئی جامع کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کتابوں کے مجموعی صفحات آٹھ ہزار سے زیادہ ہوتے ہیں۔

بیگم صاحبہ نے دفتر تاریخ قائم کرکے بڑے پیمانے پر علمی کتابیں لکھوائیں۔ محمد امین زبیری، نیاز فتح پوری، علامہ محوی صدیقی، محمد یوسف قیصر بھوانی جالسی، محمد مہدی اور عبدالرزاق الہ آبادی اس کے کارکن تھے جن کی سرپرستی کے علاوہ ریاست سے باہر کی بے شمار علمی کتابیں حکومت کی مالی امداد سے شائع کرائیں۔ ان کتابوں میں علامہ شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق 'سیرۃ النبی' اور علامہ سید سلیمان ندوی کی 'سیرت عائشہ' بھی شامل ہے۔ بھوپال میں حمیدیہ لائبریری قائم کی جو بجائے خود علم وادب کا بیش بہا خزانہ تھی۔ 'الحجاب' اور 'ظل السلطان' ماہنامے جاری کیے اور دارالمطالعے کھولے۔ سلطان جہاں بیگم بڑی اچھی مقررہ تھیں، علمی اور ادبی اداروں میں جو تقاریر انھوں نے کیں وہ اردو کا معیاری سرمایہ ہیں۔ ہر جگہ اردو کی ترقی و سربلندی پر بے لاگ اظہارِ خیال فرماتیں اور زبان وادب کے خدمت گاروں کی امداد میں پیش پیش رہتیں۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو بیگم صاحبہ سے اور خود انھیں اس درسگاہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسی تعلق باہمی کے نتیجے میں وہ مرتبہ اس یونیورسٹی کی چانسلر منتخب ہوئیں۔

نواب سلطان جہاں کے دورِ زریں میں مشاہیر شعرا کا بھی بھوپال سے قریبی رشتہ رہا۔ جن میں شاگردِ داغ امداد علی عیش اور منشی انور علی انور کے علاوہ عبدالواسع صفا، عبدالشکور اخلاص، حافظ سلیمان خالص، شاکر علی نکہت، سید محمد میاں شہید، شاگردِ سراج میر خاں سحر، ذکی وارثی، شاگردِ ظہیر دہلوی، سید حسن ظہیری، سید امین علی عالی، مفتی فضل اللہ شفق، مظفر حسین وفا، پیرزادہ محمد اسماعیل رخشاں، شاہ اسعد الرحمن قدسی، منیر الدین منیر، حامد حسین ترمذی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

بیگم صاحبہ بڑی زمانہ شناس اور ترقی پسند خاتون تھیں۔ انھوں نے شعرا کو قصائد اور غزلیات سے اجتناب کرکے اپنی توجہ ایسی اصلاحی شاعری کی طرف مبذول کرنے کا مشورہ دیا جو قوم کی صحیح تربیت اور اصلاحِ حال کا باعث ہو۔ گویا آج کی اصطلاح میں شاہجہاں بیگم نے 'ادب برائے زندگی' کے نظریے کی تخلیق واشاعت پر زور دیا جس کی وجہ سے اصلاحی ادب کے ساتھ ساتھ سادگی، حقیقت نگاری اور معنی خیز جدت شعرا کے کلام میں در آئی۔ عہد سلطانی میں مشاہیر علم وادب کا بھی بھوپال کی طرف خصوصی رجوع ہوا۔ بھوپال جغرافیائی محلِ وقوع کے لحاظ سے وسط ہند میں واقع ایک اہم ریاست تھی۔ والیانِ ریاست کی ادب پروری اور علمی خدمات سے اس کی حیثیت وہی ہوگئی جو عباسی عہد میں بغداد کو حاصل تھی۔

نواب سلطان جہاں کی فیاضانہ علمی و ادبی خدمات اور مشاہیر ادب کی سرپرستی کے اثرات ان کے جانشین صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں نے بھی قبول کیے اور ادب نوازی کی یہ روایت بیگم صاحبہ کے بعد علامہ اقبال، سر راس مسعود، علامہ سید سلیمان ندوی جیسے مشاہیر کی سرپرستی وقربت کی صورت میں جاری رہی۔ نواب حمید اللہ خاں کی بیگم میمونہ سلطان نے علامہ شبلی نعمانی کے رسالے 'بدر الاسلام' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

جہاں تک اس عہد میں تحریر کی گئیں دیگر علمی، مذہبی اور ادبی تصانیف کا سوال ہے تو انھیں کسی خاص صنف یا موضوع تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں طنز و مزاح، ڈراما، شاعری، افسانہ نگاری ہی نہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ، تذکرہ، سوانح، زبان، نقد و نظر، سفرنامے، طب، سائنس و سائنسی علوم اور دیگر زبانوں سے تراجم کا کام شامل ہے جسے اہل قلم حضرات نے نہایت جاں فشانی کے ساتھ انجام دیا۔ بہ قول معروف محقق پروفیسر سید علی الرحمن، مذکورہ موضوعات پر اس عہد کی تصانیف کی تعداد پانچ سو سے متجاوز ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے بعد اسلامی موضوعات پر سب سے زیادہ کتابیں مولوی ذوالفقار

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ۔۔۔ (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org